جناب عبدالمنعم النمر الازہری
مترجم: ڈاکٹر محمد ریاض

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے عواقب اور مسلمان

۱۸۵۷ء میں برِ عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں اور دوسری قوموں نے انگریزوں کے خلاف ایک خونین انقلاب بپا کرنے کی ٹھانی۔ اس انقلاب کو فوجیوں نے شروع کیا اور رفتہ رفتہ سارے باشندوں میں سرایت کر گیا اور ایک ہمہ گیر جنگِ آزادی شروع ہو گئی۔ مبارزانِ حریت نے بڑی قربانیاں دے کر دہلی پہ قبضہ کر لیا اور آخری مغل تاجدار سراج الدین بہادر شاہ ظفر کو اپنا رہنما اور سارے ہندوستان کا حکمران قرار دیا۔ انیسویں صدی کی یہ ایک بڑی جنگ تھی جو مئی ۱۸۵۷ء سے اواخر ۱۸۵۹ء تک جاری رہی۔ ابتدا میں حریت پسندوں کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے۔ مگر پہلے سال کے موسم گرما کے اختتام پہ انگلستان سے تازہ دم فوج آ گئی اور طاقت کا توازن بگڑ گیا۔ فروری ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے دہلی پہ قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح جنگِ آزادی سرد پڑ گئی۔ البتہ لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں جنگی سرگرمیاں شدت سے جاری رہیں۔ یہاں تک کہ انگریز غالب آ گئے۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار ہوئے۔ انگریزی عدالت نے انھیں پہلے پھانسی کی سزا سنائی پھر اسے عمر قید میں بدل دیا۔ انھوں نے بحالتِ قید رنگون میں وفات پائی اور سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

اس جنگِ آزادی میں بھی دیگر جنگوں کی مانند مسلمانوں نے بہت نمایاں حصہ لیا تھا اور اس میں ناکامی کے بعد ان ہی کو اس کی سزا بھی بھگتنی پڑی۔ انگریزوں نے مسلمانوں سے جنگِ آزادی کا پورا انتقام لیا اور ان کو ہمیشہ اپنا خطرناک دشمن سمجھتے رہے۔

لارڈ ایلن برا نے کہا تھا: "ہم اس واضح حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ مسلمان قوم ہماری سخت دشمن ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم ہندوؤں کی خوشنودی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔" اپنے قدم جمانے کی ابتدا سے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ کار کی یہی پالیسی رہی کہ

ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھا جائے تاکہ اس طرح مسلمانوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک بآسانی جاری رہ سکے۔ انگریز مسلمانوں کی دل آزاری کے ضمن میں ہندوؤں کی صوری و معنوی حمایت کرتے تھے۔ مثلاً اسی واقعہ کو لے لیں:۔

۱۸۴۲ء میں انگریزوں نے افغانستان کی فوجوں کو شکست دے دی۔ ان کا سیاسی نمائندہ سر ہنری راولسن غزنی سے گزرتے ہوئے ہندوستان آیا اور اپنے ساتھ محمود غزنوی کے مزار کے ایک بڑے دروازے کو بھی اکھڑوا لایا۔ اس کا کہنا تھا کہ "یہ وہی دروازہ ہے جسے سلطان سومنات سے ساتھ لے گیا تھا اور اب میں اسے اصل مقام پر رکھوا دوں گا"۔ سر ہنری راولسن کا یہ اقدام مسلمانوں کی دل آزاری اور ہندو اکثریت کی خوشنودی پر مبنی تھا۔ کیونکہ سلطان محمود غزنوی برِّ عظیم کے مسلمانوں کا ہیرو ہے مگر ہندوؤں کی نظر میں منفور ہے۔

انگریز جوشِ انتقام میں مسلمانوں کی حق تلفیاں کر رہے تھے مگر ہندو عام طور پر مورد عنایات تھے۔ پنڈت نہرو نے بھی لکھا ہے: "مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ نشانۂ ستم بنایا گیا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ مسلمان زیادہ بہادر اور جراءت مند ہیں۔ وہ ابھی تک برِّ عظیم میں اپنی حکمرانی کے عہد کو نہیں بھولے، اس لیے حکومتِ انگلستان ان کے خطرہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی"۔ انگریز مؤرخ، ولیم ہنٹر نے ۱۸۷۱ء کے وقائع میں اس بات کو بانداز دیگر لکھا ہے کہ: "ہندوستان میں ہماری مسلمان رعایا اپنے جرمِ بغاوت سے اب انکار نہیں کرتی، اس کے باوجود وہ اب بھی ملکۂ انگلستان کی حکومت کی مخالفت سے باز نہیں رہ سکتے۔ انگریز ۱۸۵۷ء کی خونریز جنگِ غدر (آزادی) میں مسلمانوں کی پیش قدمی دیکھ چکے تھے۔ افغانستان میں بھی ان کی سرفروشی سب کو معلوم ہے۔ وہ اب بھی انگریزوں کے جانی دشمن ہیں۔ افغانستان اور مرکزی ایشیا میں لوگ دینِ اسلام پر بڑی شد و مد سے عامل ہیں۔ حریت و آزادی کی خاطر سرفروشی کرنے کو وہ اپنا دینی تقاضا جانتے ہیں"۔

شیخ شامل نے قفقاز کی آزادی کی خاطر ۲۵ سال تک روسیوں سے جنگ کی، اور آخر کار اگرچہ انھیں شکست ہوئی مگر انگریز ان کی حریت دوستی اور قوتِ مبارزہ کو بخوبی مشاہدہ کر چکے تھے۔ ان کے جذبۂ مبارزہ کو نہ قفقاز کی شکست سرد کر سکی اور نہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی۔

جنگِ آزادی کے نتیجے میں برِعظیم ایسٹ انڈیا کمپنی کی حدود سے نکل کر برطانیہ عظمیٰ کا جزو قرار پایا۔ مسلمان جو برِعظیم کے حاکم رہے تھے، بدستور شک و تردد کی نظر سے دیکھے جاتے رہے اور انگریزوں کی کوشش تھی کہ ان کا دورِ اقتدار نہ لوٹ سکے۔ ظاہر ہے کہ ہندو اکثریت کو بھی انگریزی استعمار کی یہ ادا پسند تھی۔

مسلمان سرکاری ملازمت سے محروم رکھے جا رہے تھے۔ ہندو ساہوکار، قرض میں ان کا بال بال ڈبوتے اور بعد میں ان کی جائدادیں قرق کروا دیتے تھے۔ "کالوں" کی خاطر مخصوص نوکریوں پر ہندو اور دیگر غیر مسلم چھائے ہوئے تھے۔ غیر مسلم مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی سے خوش تھے کہ ملک کے سابق حکمران آج اس کس مپرسی میں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگِ آزادی کے عواقب سب ہی بھگت رہے تھے، مگر مسلمان ایک باقاعدہ اسکیم کے ماتحت ہدفِ ظلم و ستم بنائے جا رہے تھے لیکن آفرین مسلمانوں کے حوصلوں پہ کہ مصائب اور معاشی زبوں حالی میں بھی وہ اسی طرح بلند ہمت تھے۔

مجاہدین سر سے کفن باندھے، حریتِ وطن اور حمیتِ دین کی بازیابی کی خاطر کوشاں تھے۔ سید احمد بریلویؒ نے اسی میدان میں قوت صرف کر کے ۱۸۳۱ء میں درجۂ شہادت حاصل کر لیا تھا۔ انگریز مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو سرد کرنے کے درپے تھے۔ انھوں نے ایک طرف نام نہاد علماء (علمائے سوء) سے جہاد کے خلاف فتوے لیے، اور دوسری طرف مجاہدینِ حریت پر بے پناہ مظالم کیے۔ نام نہاد علما نے فتویٰ دیا تھا کہ "جب تک انگریز ادائے نماز اور احکامِ شریعت کی بجاآوری میں مخل نہ ہوں، ان کے خلاف جہاد کرنا خلافِ مصلحت اور بیہودہ کام ہے"[1]۔ یہ فتویٰ دراصل حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ کے توڑ کی خاطر لیا گیا تھا۔ موصوف نے ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کو ملک سے نکالنے کی خاطر جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور چند افرنگ مآبوں کے سوا سب مسلمانوں کو آپ کی رائے سے اتفاق تھا۔ ۱۷ جولائی ۱۸۷۰ء کو مکہ معظمہ سے ایک فتویٰ جاری ہوا جس پر حنفی، شافعی اور مالکی مذہب کے ایک ایک عالم اور برِعظیم کے نو علما کے دستخط تھے۔ ولیم ہنٹر اس فتوے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے[2] کہ ہمسلمان آخر

---

[1] از مترجم اردو۔ اقبال کا ایک شعر ہے: مُلا کو ہے جو ہند میں سجدے کی اجازت + ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

[2] ہندوستانی مسلمان مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین (اردو)

وقت تک شکست خوردہ اور مایوس نظر نہ آتے تھے۔

مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے انگریز بہت خوفزدہ تھے اور انھیں کمزور کرنے کے لیے اپنے کارندوں سے کام لینے لگے۔ چنانچہ انھوں نے ایک ایسی تحریک کی حمایت شروع کر دی جس کا مقصد مسلمانوں کے دماغ سے جہاد کا خیال نکال دینا تھا۔ مگر جب ان حربوں سے جہاد کا جذبہ مزید برانگیختہ نظر آنے لگا، تو انھوں نے جمہور مسلمانوں کے عقائد کا سہارا لے کر مجاہدین کو بدنام کروانے کی کوشش کی۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کی دعوتِ جہاد پر لبیک نہ کہیں۔ عبدالوہاب نجدی کی تحریک کے کئی پہلو تھے جن کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کی جا سکتی ہے، مگر انگریزوں نے اس تحریک کے ایک ہی پہلو یعنی قبہ شکنی پر زور دیا، اور مشہور کر دیا کہ جہاد کے مؤید علما (از انجملہ سید احمد اور سید اسماعیل بریلوی) اسی قبیل کے لوگ ہیں جو بزرگوں کے مزارات پر جانے کے خلاف ہیں، اور مزارات پر نشانات و قبہ جات بنانے کے مخالف ہیں۔ ظاہر ہے کہ سرزمین عرب میں مقابر توڑے جانے کے واقعہ پر مسلمان برافروختہ تھے، اس لیے بعض لوگ مجاہدین حریت کے خلاف ہو گئے مگر مجاہدین آزادی نے ان امور کی پرواہ نہ کی۔ یہ بے باک، نڈر اور راست باز لوگ تھے۔ پروفیسر ابوالحسن علی ندوی نے ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے: "مجاہدین کسی لالچ، تہدید اور خوف و خطر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کی املاک ضبط و قرق ہو رہی تھیں۔ ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، انگریزی عدالتیں انھیں پھانسی، عمر قید اور جلاوطنی کی سزائیں دے رہی تھیں مگر ان کے چہرے جذبۂ ایمان کے پرتو سے منور تھے۔ وہ سچے مومن تھے۔ اور اطمینانِ قلب سے بہرہ مند تھے"[1] پروفیسر موصوف نے مجاہدین کے بعض غیر معمولی جرأت آموز وقائع نقل کیے ہیں، مثلاً:

۲ مئی ۱۸۶۴ء کو انبالہ کی انگریز عدالت نے چند معصوم "مجرموں" کو طلب کیا۔ ان پر سید احمدؒ اور سید اسماعیلؒ کے ارادت مندوں کی حمایت کرنے اور بعض کی افغانستان میں کمک کرنے کا الزام تھا۔ انگریزوں نے انھیں اپنی فوج متعینہ پٹنہ، جھانسی اور لاہور کے ذریعے گرفتار کیا تھا۔ اتنے میں ایک خوبصورت نوجوان جعفر کو لایا گیا۔ جج نے اسے کہا کہ تم پڑھے لکھے اور شریف خاندان کے ایک فرد ہونے کے باوجود قانون شکنی کرتے اور حکومت کے خلاف زہر اگلتے ہو۔ تم افغانستان میں ہمارے دشمنوں کی اعانت کرتے ہو، جو

---

[1] مجلۃ المسلمون، دمشق۔ بابت ماہ جمادی الآخر ۱۳۹۱ھ۔

غداری کے مترادف ہے اس لیے تمھیں پھانسی دی جائے گی۔ تمھارا سارا مال بحق سرکار ضبط ہوگا۔ تمھاری لاش تمھارے ورثا کو نہیں ملے گی اور اسے عام قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔" جعفر یہ سب خندہ پیشانی سے سنتا رہا اور بولا: "زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کو کیا خبر کہ پہلے کون مرے گا اور کہاں؟" پرسن نامی انگریز نے یہ بات سُن کر کہا: "تم تو موت کی پرواہ نہیں کرتے!" جعفر بولا: "ہاں، یہ ذوقِ شہادت ہے جو چکھتا ہے، وہی اس کی حلاوت جانتا ہے۔" اسی عدالت میں مولانا یحییٰ صادق پوری اور محمد شفیع نامی دو اشخاص لائے گئے۔ ان کا محاکمہ جاری تھا کہ آٹھ دیگر افراد کو جلاوطن کر دیا گیا۔ مولانا یحییٰ صادق پوری پھانسی کے منتظر تھے اور مشہور شہید صحابی حضرت خبیبؓ کے آزروئے شہادت پر مبنی اشعار پڑھ رہے تھے مثلاً: "اب میں مسلمان ہوں۔ اگر مارا جاؤں تو پرواہ نہیں زمین پر کس پہلو گروں گا۔ یہ خدا کا معاملہ ہے۔ اگر وہ چاہے تو میرے شکستہ اعضا و جوارح کو بھی اپنی رحمت کا پورا حصہ دے گا۔"

اس رجز خوانی کا مفہوم معلوم کر کے انگریز بوکھلا گئے۔ انھوں نے مولانا یحییٰ کو پھانسی دی اور نہ پنجاب کے نوجوان جعفر کو۔ وہ غصّے میں دیوانے تھے کہ مسلمانوں کو مرنے میں بھی لذت ملتی ہے۔ وہ اب عمر قید کی سزائیں دینے لگے۔ جسمانی سزائیں دیتے اور ملزموں کو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں منتقل کرتے رہتے۔ آخری بڑی جیل جزائر انڈیمان (خلیج بنگال) میں تھی جس میں عمر قید کے سزایاب پہنچائے جاتے تھے۔ مولانا یحییٰ صادق پوری اسی جگہ فوت ہوئے اور جعفر ۱۸۸۳ء میں رہا ہوا۔ ان مثالوں سے واضح ہے کہ مسلمان بے پناہ جرأت مندی کے ساتھ نبرد آزما اور متحمل مصائب رہے ہیں۔

جنگِ آزادی کے بعد مسلمان دینی تعلیم کی طرف خاص طور پر راغب ہوتے۔ یہ رغبت شعوری تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنی نمایاں خصوصیات اور تعلیماتِ جہاد و غزا کو حفظ کر لیں۔ اب تک دینی تعلیم مساجد میں ہوتی تھی۔ دیوبند (واقع سہارن پور) کی ایک چھوٹی سی مسجد کے پہلو میں ایک صالح مسلمان نوجوان نے ایک جداگانہ مدرسہ بھی قائم کر دیا۔ "مدرسہ العلوم" نامی مدرسے کو مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے فرزند نے قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ انگریزی اعانت سے مبرّا تھا۔ مسلمان رضاکارانہ طور پر اس کا انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ایک "دارالعلوم" بن گیا۔

یہ دارالعلوم برعظیم کے مسلمانوں کا غالباً سب سے بڑا دینی مدرسہ رہا ہے۔ دیوبند کی ۳۰ ہزار کی آبادی

کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ یہ سارے برعظیم کے مسلمان نوجوانوں کو اپنے اقامتی ماحول میں جگہ دیتا تھا۔ بعد میں یہ ایشیا کا ایک نمایاں مرکزِ تعلیم قرار پایا اور دیگر اسلامی ممالک کے طلبہ بھی یہاں داخل ہونے لگے۔ ۱۸۶۷ء میں جب یہ مدرسہ شروع ہوا اس وقت ایک طالب علم (محمود الحسن) تھا اور ایک استاد (قاری محمود) تھا اور انتظام مولانا رشید احمد گنگوہی کے ہاتھ میں تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس کا پہلا طالب علم، ایک بے بدل حریت طلب نکلا۔ مولانا محمود الحسن، جنھیں احتراماً "شیخ الہند" کہا جاتا ہے، دو بار قید ہوئے اور دوسری بار ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے۔

دار العلوم دیوبند ایشیا کی دانش گاہِ ازہر رہی ہے۔ عربی زبان کی ترویج و تحفظ اور مغربی تہذیب و تمدن کے طوفان کو روکنے کے بارے میں اس مدرسے کی مساعی قابلِ تشکر ہیں۔ پروفیسر ابوالحسن علی ندوی نے بجا لکھا ہے کہ برعظیم کے مصلحین نے رجوع الی الدین اور زمانے کے رنگ میں رنگے جانے کی بظاہر متضاد تعلیمات دیں، مگر یہ تضاد مسلمانوں کے لیے مفید رہا ہے۔ پہلی تعلیمات کا مظہر دیوبند اور دیگر مدارس ہیں جبکہ دوسری فکر مدرسۂ علی گڑھ کی خصوصیت رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر علمائے دین آڑے نہ آتے تو عیسائی مبلغین اور مغربی انتقام جو برعظیم کے مسلمانوں کے لیے مزید باعثِ پریشانی بنتے، اور سرسید احمد خان جیسے لوگ نہ ہوتے تو ان کی پسماندگی، بڑھتی ہی چلی جاتی۔

انگریزوں کی درشتی، تعصب اور انتقام جوئی نے مسلمانوں کو ان سے ایسا متنفر کر رکھا تھا کہ وہ انگریزی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے روادار نہ تھے۔ اس طرح عوام و حکومت کے درمیان رابطے کی زبان — انگریزی — سے مسلمان مدتوں نابلد اور بے بہرہ رہے اور انگریزی زبان کے ساتھ انگریزی نما کلچر کی ہر بات سے مسلمانوں کو "ابا" تھا۔ ان حالات میں ان کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی اور وہ ملازمتوں کے لیے نااہل قرار دیے جانے لگے۔ انگریزوں کے علاوہ ہندو اکثریت بھی مسلمانوں کو دبانے لگی۔ ان حالات کی اصلاح کی خاطر سرسید احمد خان نے سعی کی اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ قائم کیا۔

(باقی آئندہ)